کہنی سے خطاطی کرنے والے

آئینہ/مسعود اشعر

قریب دو سال پہلے کی بات ہے۔ سنگاپور کے بڑے بازار میں ایک عجیب تماشہ میں نے دیکھا۔ ایک گول مٹول چینی اپنی کہنی سے خطاطی کر رہا تھا۔ جی ہاں، اپنی کہنی سے لکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک پیالے میں سیاہی گھلی رکھی تھی۔ وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی کہنی اس سیاہی میں ڈبوتا۔ پھر سامنے رکھے بڑے سے سفید کاغذ پر نہایت خوش نما چینی حروف لکھ دیتا۔ اس کے اردگرد تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ کاغذ پر کچھ لکھتا اور ساتھ کھڑا کوئی آدمی اس سے وہ خرید لیتا۔ وہ کیا لکھ رہا تھا؟ میرے پاس کھڑی ایک چینی خاتون نے بتایا کہ فلاں کاغذ پر اس نے خوش آمدید لکھا ہے، اور فلاں کاغذ پر سال اچھا گزرنے کی دعا، اور اس کاغذ پر نئے آنے والے کے لئے نیک خواہشات۔ وہ شخص واقعی اپنی کہنی سے اتنے خوب صورت چینی حروف بنا رہا تھا کہ ہر کاغذ پر باقاعدہ پینٹنگ بنی دکھائی دیتی تھی۔ ایسی پینٹنگ جسے فریم کرا کے اپنے گھر میں سجایا جائے تو ہر آنے والا اس کی تعریف کرنے کھڑا ہو جائے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ تم نے کوئی پینٹنگ یا کوئی کاغذ خریدا؟ دراصل ان کی قیمت ہی اتنی تھی کہ میں غریب اپنی جیب کو ہی دیکھتا رہ گیا۔ اب سچ مچ افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنے دل پر جبر اور جیب پر بھروسہ کر کے کوئی کاغذ خرید ہی کیوں نہیں لیا۔ آج کم سے کم میرے پاس یہ دکھانے کو تو ہوتا کہ دیکھو یہ کہنی آرٹ ہے۔

یہ واقعہ مجھے پاکستان آرٹسٹس اینڈ کیلی گرافرز گلڈ دیکھ کر یاد آیا۔ اس گلڈ کا دفتر قذافی اسٹیڈیم کے ساتھ اوپن ایئر تھیٹر کے اوپر ایک کمرے میں ہے۔ یہ ادارہ خطاطی کے فن کو زندہ رکھنے بلکہ اسے فروغ دینے کے لئے کام کر رہا ہے۔ جس محفل میں اس گلڈ سے میرا تعارف ہوا وہ تو انتظار حسین کے ساتھ ایک شام قسم کی چیز تھی لیکن حنیف رامے کی موجودگی نے اس شام کا رشتہ بھی آرٹ اور خطاطی کے ساتھ قائم کر دیا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ حنیف رامے پہلے آرٹسٹ ہیں جنہوں نے خطاطی کو بھی پینٹنگ کا درجہ دیا۔ ان کے بعد ہی دوسرے آرٹسٹوں نے اسے اپنا موضوع بنایا۔ میں نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ اگر کمپیوٹر نہ آتا تو دنیا کی کئی زبانیں اگر ختم نہ ہو گئی ہوتیں تو آخری دموں پر تو ضرور ہوتیں۔ لیکن اسی کمپیوٹر نے ایک طرح سے خطاطی کے فن کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اب خوش نویس اور خطاط کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور جب کسی ہنر مند کے ہنر کی ضرورت نہیں رہتی تو وہ ہنر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کمپیوٹر انسانی مدد کے بغیر خود بخود ہی چل رہا ہے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر بھی انسان ہی بناتے ہیں۔ اور اگر ہمارے اچھے خوش نویس کمپیوٹر کے سافٹ ویئر کے لئے اپنے ہاتھ سے خطاطی نہ کرتے تو کمپیوٹر بھی ہمارے کسی کام نہ آتا۔ مگر ہوتا یوں ہے کہ ایک مرتبہ کوئی خط کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا گیا تو اس کے بعد فارغ۔ اب کمپیوٹر خود ہی کام کرتا رہے گا۔ اس طرح خوش نویس بے کار ہوتے چلے گئے۔ اور لاہور کی وہ بیٹھکیں جو بڑے بڑے خطاطوں کے نام سے جانی جاتی تھیں اجڑ گئیں۔ اس فن میں نیا خون آنا بند ہو گیا۔ اس صورت میں اس فن کو اگر برقرار رکھا جا سکتا ہے تو اسے آرٹ فارم کی شکل میں زندہ رکھ کر۔ یہ گلڈ اسی لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی شاخیں پاکستان کے ہر شہر میں موجود ہیں۔ اس کے کارکنوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں کسی معاوضہ کے بغیر داتا کامپلیکس میں خطاطی کی۔ اسی طرح قادر یار کے روضے کو بھی انہوں نے اپنی خطاطی سے سجایا۔ یہ صحیح ہے کہ کمپیوٹر سافٹ ویئر کے لئے یا کتابوں کے نام وغیرہ لکھنے کے لئے کاتبوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی لیکن اس کے لئے کتنے کاتبوں کی ضرورت ہو گی؟۔ یہی دو چار۔ اس لئے اس فن کو واقعی آرٹ بنا کر ہی زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی کام یہ لوگ کر رہے ہیں۔

سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں صرف ہمارے نامی گرامی خوش نویس ہی شامل نہیں ہیں بلکہ روی صاحب اور بشیر موجد جیسے آرٹسٹ بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ بشیر موجد ہی ایک طرح سے اس کے روح رواں ہیں۔ موجد آرٹسٹ ہیں، خطاط ہیں اور ایک ایسی کتاب کے مصنف ہیں جس نے ہمارے سامنے صرف ان کی اپنی زندگی کا اتار چڑھاؤ ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ پاکستان کے پچاس باون سال کی فنی تاریخ بھی محفوظ کر دی ہے۔ موجد کی کتاب "بولتے رنگ سوچتی لکیریں" ہماری ملاقات ان تمام زیادہ معروف اور کم معروف لوگوں سے کراتی ہے جو اس ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے آرٹ، ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کا حصہ رہے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا انداز بیان اور وہ سچائی ہے جسے موجد نے بعض خطرے مول لے کر بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ موجد کا ذکر میں اس تفصیل سے اس لئے کر رہا ہوں کہ اگر گلڈ موجد جیسے بے لوث فن کاروں کے ہاتھ میں رہا تو ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ یہ فن شریف نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ اسے نئی جہتوں سے بھی روشناس کرایا جائے گا۔ کسی زمانے میں لاہور پورے ہندوستان میں اس فن کا مرکز اور گہوارہ تھا۔ جب پرنٹنگ پریس یہاں نہیں پہنچا تھا تو لاہور کی بیٹھکوں میں بیٹھے دیدہ ریزی کرنے والے خوش نویس ہی کتابوں کی نقلیں کر کے ساری مسلم دنیا میں بھیجا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت کم کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کسی نے سوچا ہی نہیں تھا کہ خطاطی کے وہ نمونے ایک دن ہمارا قیمتی اثاثہ اور یادگار بن جائیں گے۔ اب ہم امید کر سکتے ہیں کہ یہ گلڈ ایسے تمام قیمتی نمونے ایک جگہ اکٹھے کرنے کا اہتمام بھی کرے گا۔ اس گلڈ کی ایک اور بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو صرف آرٹ اور خطاطی تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس نے ادب اور ادیبوں کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم کیا ہے۔ ہمارے ہاں خرابی یہ رہی ہے کہ آرٹسٹوں، ادیبوں اور موسیقاروں نے اپنے الگ الگ خانے بنا رکھے ہیں۔ حالانکہ ان کے میل جول سے ہی فنون لطیفہ کو فروغ ملتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ اگر کمپیوٹر جیسی مشینیں قدیم علوم و فنون کو پیچھے دھکیلنے لگیں تو کہنی سے خطاطی کرنے والے سامنے آ جاتے ہیں اور فن محفوظ ہو جاتا ہے۔